آخری قسط

آیت استخلاف اور خلافت معاویہ رضی اللّٰہ عنہ

پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو آیت استخلاف کا مصداق قرار دینے پر ایک اہم اشکال وارد ہوتا ہے کہ وعدہ استخلاف میں ''وَعَدَ، اٰمَنُوْا، عَمِلُوْا'' یعنی ماضی کے صیغے آئے ہیں جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس سے وہی لوگ مراد ہیں جو نزول آیت سے پہلے ایمان لا چکے تھے اور وہ لوگ اس وعدہ انعام سے خارج ہیں جو نزول آیت کے وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس توجیہہ وتوضیح کی بنا پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ آیت استخلاف کے مصداق نہیں ہو سکتے کیونکہ (بعض لوگوں کی تحقیق کے مطابق) اس وقت (یعنی نزول آیت) تک اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ:

ماضی کا صیغہ صرف ماضی کے لیے ہی استعمال نہیں ہوتا بلکہ کبھی آئندہ فعل کی ابتدا اور مستقبل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ خود قرآن مجید میں اس کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں:

(۱)　اسی سورۃ النور (جس میں آیت استخلاف ہے) کی پہلی آیت میں ماضی کا صیغہ آیا ہے لیکن گزشتہ فعل کے لیے نہیں بلکہ آئندہ فعل کی ابتدا کے لیے استعمال ہوا ہے:

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ...... (النور:۱)

ترجمہ:　یہ سورت ہے جسے ہم نازل کرنے اور اس کے احکام کو مقرر کرنے اور اس میں صاف صاف آیتیں نازل کرنے کو ہیں۔

اس پہلی آیت میں تینوں صیغے ماضی کے آئے ہیں لیکن گزشتہ فعل کے لیے نہیں بلکہ آئندہ فعل کی ابتدا کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

(۲)　وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ...... (الانعام:۱۱۹)

ترجمہ:　تمہیں کیا ہے کہ جس چیز پر اللہ کا نام لیا گیا ہے تم اسے نہیں کھاتے ہو اور (اب) وہ تمہارے لیے حرام کردہ اشیا کو تفصیل سے بیان کرنے لگا ہے۔

یہاں اشکال وارد ہوتا ہے کہ ''فَصَّلَ'' ماضی کا صیغہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ محرمات تفصیل کے ساتھ سورۃ انعام سے پہلے بیان ہو چکی ہیں حالانکہ سورۃ بقرہ اور سورۃ مائدہ بالاتفاق سورۃ انعام کے بعد نازل ہوئی ہیں کیونکہ سورۃ بقرہ اور سورۃ مائدہ دونوں مدنی ہیں جب کہ سورۃ انعام مکّی ہے۔

بعض حضرات نے اس اشکال کا یہ جواب دیا ہے کہ اس سے سورۃ النحل میں بیان کرنا مراد ہے جو سورۃ انعام سے پہلے نازل ہوئی تھی۔ مگر اس میں مزید ایک اشکال یہ ہے کہ سورۃ النحل میں محرمات کا ذکر تفصیلی نہیں بلکہ بہت کم ہے۔ اس لیے اس کی بہتر توجیہ یہ ہے کہ یہاں ماضی کا صیغہ گزشتہ فعل کے لیے نہیں بلکہ آئندہ فعل کی ابتدا کے لیے ہے۔ جس طرح سورۃ النور کی مذکورہ بالا پہلی آیت میں ماضی کا صیغہ آئندہ فعل کی ابتدا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس توجیہ کی رو سے ''قَدْ فَصَّلَ'' کے معنیٰ ہوں گے کہ وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) محرمات کی تفصیل بیان کرنے کو ہے۔ چنانچہ اس کے فوراً بعد محرمات کا بیان ہے۔

(۳) وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ. (التوبہ:۱۰۰)

ترجمہ: اور سب سے آگے آگے، سب سے پہلے پہلے ایمان لانے والے مہاجرین اور انصار سے اور جنھوں نے پیروی کی ان کی عمدگی سے راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان سے اور وہ راضی ہو گئے اس سے اور اس نے تیار کر رکھے ہیں ان کے لیے باغات بہتی ہیں ان کے نیچے ندیاں، ہمیشہ رہیں گے اس میں ابد تک، یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

''مفسرینِ سلف کے اقوال ''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْن'' کی تعیین میں مختلف ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ مہاجرین و انصار مراد ہیں جو ہجرت سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ بعض کے نزدیک وہ مراد ہیں جنھوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی۔ بعض کہتے ہیں کہ جنگ بدر تک کے مسلمان سابقین اوّلین ہیں۔ بعض حدیبیہ تک اسلام لانے والوں کو اس کا مصداق قرار دیتے ہیں اور بعض مفسرین کی رائے ہے کہ تمام مہاجرین و انصار، اطراف کے مسلمانوں اور پیچھے آنے والوں کی نسلوں کے اعتبار سے سابقین اوّلین ہیں۔

ہمارے نزدیک ان اقوال میں چنداں تعارض نہیں ''سبقت و اوّلیت'' اضافی چیزیں ہیں۔ ایک ہی شخص یا جماعت کسی کے اعتبار سے سابق اور دوسرے کے اعتبار سے لاحق بن سکتی ہے۔'' (تفسیر عثمانی تحت الآیۃ)

مذکورہ تفسیر سے معلوم ہوا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ''سابقین اوّلین'' میں شامل ہیں کیونکہ اگر وہ بعض کے ''لاحق'' ہیں تو اکثر کے ''سابق'' بھی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ قبل از فتح مکّہ مسلمین اور پھر مہاجرین میں بھی شامل ہیں۔

سورۃ التوبہ بالاتفاق مدنی ہے اور اس کے واقعات و مضامین اور ترتیب نزولی کے نمبر ۱۱۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ مبارکہ ۹ھ میں نازل ہوئی۔ کیونکہ غزوہ تبوک رجب ۹ھ میں ہوا اور مشرکین سے عام بے زاری اور قطع تعلقات کا اعلان بھی اس حج کے موقع پر کیا گیا جو ذی الحجہ ۹ھ میں ادا کیا گیا تھا۔

زیرِ بحث آیت میں بصیغۂ ماضی، مستقبل میں مہاجرین و انصار کی احسان کے ساتھ پیروی کرنے والوں کو ویسی ہی بشارات دی گئی ہیں ظاہر ہے کہ اس پیروی میں ''امورِ خلافت'' بھی شامل ہیں تو جس طرح مستقبل میں دیگر احکام میں اخلاص

کے ساتھ ’’سابقینِ اوّلین‘‘ کی پیروی کرنے والے وعدہ مغفرت ورضوان کے مصداق ہوسکتے ہیں تو امورِ خلافت میں پیروی کرنے والے بھی ’’موعودلہم‘‘ میں شامل ہوسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے آئیڈیل ہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے انہوں نے اپنی سلطنت کے نظم ونسق کو فاروقی اصولوں پر استوار کیا تھا۔ ملاحظہ ہو (’’**الاسلام والحضارۃ العربیۃ**‘‘ جلد: دوم، صفحہ: ۱۴۶)

مولانا عبدالحق خان بشیر نقشبندی امیر پاکستان شریعت کونسل پنجاب لکھتے ہیں کہ:

’’حضرت سیدنا امام حسن رضی اللّٰہ عنہ نے تو حضرت سیدنا امام معاویہ رضی اللّٰہ عنہ کے حق میں خلافت سے دست برداری کرتے ہوئے جو معاہدہ کیا تھا اس میں بصراحت یہ تحریر کیا تھا کہ:

ہم ان (یعنی امام معاویہ رضی اللّٰہ عنہ) سے اس وقت تک کوئی تعرض نہ کریں گے جب تک وہ لوگوں کے درمیان کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور خلفائے راشدین کے طریقہ کے مطابق حکومت کریں گے۔

(جلاء العیون، صفحہ: ۲۵۴۔ بحوالہ سال نامہ سرخرو، لاہور۔ امیر عزیمت شہید نمبر، صفحہ: ۵۷۱)

یہ ایک مسلّمہ تاریخی حقیقت ہے (جسے کوئی بھی طبقہ ہرگز نہیں جھٹلا سکتا) کہ حضرت حسن رضی اللّٰہ عنہ (م ۵۰ ھ) اور حضرت حسین رضی اللّٰہ عنہ (م ۶۱ ھ) نہ صرف یہ کہ حضرت معاویہ رضی اللّٰہ عنہ سے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ زندگی بھر ان کے دست و بازو اور معاون رہے۔ اس سے ثابت ہوگیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللّٰہ عنہ کتاب اللّٰہ، سنت رسول اللّٰہ اور خلفائے راشدین کے طریقہ کے مطابق حکومت کرتے رہے۔ بصورت دیگر حضرات حسنین کریمین رضی اللّٰہ عنہما ضرور ان سے تعرّض کرتے۔ پھر ایسے خلیفہ کو زمرۂ خلفائے راشدین اور آیتِ استخلاف کے مصداق سے کیوں کر خارج کیا جاسکتا ہے؟

حضرت معاویہ رضی اللّٰہ عنہ کے دورِ خلافت راشدہ پر مفصّل و مدلّل بحث ایک مستقل مضمون میں پیش کی جائے گی۔ یہاں صرف آیت استخلاف میں ماضی کے صیغوں کا مستقبل پر اطلاق زیر بحث ہے۔

آیت استخلاف میں وعدہ استخلاف کو ماضی کے صیغے اور ’’منکم‘‘ کی وجہ سے ان حضرات کے ساتھ ہی خاص کر دیا جائے جو نزولِ آیت کے وقت ایمان لا چکے تھے تو معاندین یہ دعویٰ بھی کرسکتے ہیں (بلکہ کرچکے ہیں) کہ ’’**رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ**‘‘ میں چونکہ ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے اس لیے اس سے مراد نزولِ آیت کے وقت مسلمان ہیں اور بعد میں شرفِ صحابیت حاصل کرنے والے اس کا مصداق نہیں ہوسکتے۔

قرآن مجید میں ’’**رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ**‘‘ کے الفاظ سورۃ البیّنہ آیت ۸، ترتیب نزول ۱۰۰، سورہ المجادلہ آیت ۲۲، ترتیبِ نزول ۱۰۵، سورۃ المائدہ آیت ۱۱۹ ترتیبِ نزول ۱۱۲، سورۃ التوبہ آیت ۱۰۰، ترتیب نزول ۱۱۳ میں چار مقامات پر آئے ہیں۔ کیا اس کے بعد شرف صحابیت حاصل کرنے والے محض ماضی کے صیغوں کی وجہ سے ان آیات کا مصداق ہونے سے خارج ہوجائیں گے؟

جب کہ سورۃ التوبہ کی زیرِ بحث آیت کی رو سے تو اس کے عموم میں اتباع بالاحسان کی شرط کے ساتھ ساری امّت کو شریک کر دیا گیا ہے کہ بعد کے ادوار میں جب بھی اور جو شخص بھی مہاجرین و انصار کی اخلاص کے ساتھ پیروی کرے گا وہ وعدۂ رضوان و مغفرت میں شامل متصور ہوگا۔

(۴) اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا. اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا. (سورۃ النساء: ۵۳۔۵۴)

ترجمہ: کیا ان کے لیے کوئی حصہ ہے حکومت میں۔ اگر ایسا ہوتا تو نہ دیتے یہ لوگوں کو تِل برابر۔ کیا حسد کرتے ہیں لوگوں سے اس نعمت پر جو عطا فرمائی ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے (وہ حسد کی آگ میں جلا کریں) ہم نے مرحمت فرما دی ہے ابراہیم کے گھرانے کو کتاب اور حکمت اور عنایت فرما دی ہے انہیں عظیم الشان سلطنت۔

آیت میں ''ملک'' سے مراد الٰہی اقتدار و اختیار ہے اور ''الناس'' سے مراد مسلمان ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہود کا الٰہی اقتدار و اختیار میں ہرگز کوئی حصہ نہیں ہے اگر یہ حاکم ہو جائیں تو اپنے بخل کی وجہ سے کسی کو تِل برابر بھی نہیں دیں گے۔

علاوہ ازیں یہ بنی اسماعیل کو کتاب و حکمت اور سلطنت و خلافت عطا کر دیے جانے کی وجہ سے ان سے حسد کر رہے ہیں لیکن ہم آلِ ابراہیم (بنی اسماعیل) کو کتاب و حکمت کے ساتھ ساتھ عظیم الشان خلافت اور سلطنت و حکومت بخش چکے ہیں۔

ظاہر ہے کہ نزولِ آیت کے وقت یہ وعدہ مکمل طور پر ظاہر نہیں ہوا تھا اور نہ ہی خلافت و حکومت عطا ہوئی تھی۔ مستقبل میں یہ وعدہ ظہور پذیر ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے بصیغۂ ماضی ''اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا'' اس کا اعلان فرمایا کہ فیصلۂ الٰہی صادر ہو چکا ہے۔

اس آیت سے ایک لطیف نکتہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت و خلافت، کتاب و حکمت کے ثمرات و نتائج میں سے ہے جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو کتاب و حکمت کی نعمت عطا فرماتا ہے اور وہ قوم اخلاص کے ساتھ اسے قبول بھی کر لیتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو امامت و خلافت کا منصب بھی سونپ دیا گیا۔ زیرِ بحث آیت میں فعل ''اٰتَيْنَا'' کے تکرار میں عظیم بلاغت پائی جاتی ہے کہ یہود کا سارا حسد تو اسی وجہ سے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ اس قرآن کے ساتھ خلافت فی الارض بھی وابستہ ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس حسد پر کاری ضرب لگانے کے لیے بصیغۂ ماضی فرمایا:

''فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا'' کہ ہم نے نہ صرف کتاب و حکمت بنی اسماعیل کو دی بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک عظیم سلطنت بھی ان کو دی۔

اسی وعدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے عہدِ خیر القرون میں آلِ ابراہیم و بنی اسماعیل کے ایک ممتاز فرد صحابیِ رسول حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ۶۵ لاکھ مربع میل پر مشتمل وسیع و عظیم سلطنت عطا فرمائی جب کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ سلطنت گیارہ لاکھ مربع میل، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں بائیس لاکھ مربع میل، حضرت

عثمان رضی اللّٰہ عنہ کے دور میں چوالیس لاکھ مربع میل، حضرت علی رضی اللّٰہ عنہ کے دور میں بائیس لاکھ مربع میل اور حضرت حسن رضی اللّٰہ عنہ کے ششماہی دور میں بھی بائیس لاکھ مربع میل پر مشتمل تھی۔

(۵) وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ. یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤی اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ. (سورۃ المائدہ: ۲۰،۲۱)

ترجمہ: اور جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے، اے میری قوم! یاد کرو اللّٰہ کا احسان جو تم پر ہوا۔ جب بنائے اس نے تم میں سے انبیا اور بنایا تمھیں حکمران اور عطا فرمایا تمھیں جو نہیں عطا فرمایا تھا کسی کو سارے جہانوں میں۔ اے میری قوم داخل ہو جاؤ اس پاک زمین میں جسے لکھ دیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اور نہ پیچھے ہٹو پیٹھ پھیرتے ورنہ تم لوٹو گے نقصان اٹھاتے ہوئے۔

یہاں بھی اللّٰہ تعالیٰ نے ماضی کے صیغے سے بادشاہ بنانے کا وعدہ کیا جو مستقبل سے متعلق ہے۔ یہ وعدوں کی قطعیت کے اظہار کا ایک بلیغ اسلوب ہے جو قرآن میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ گویا یہ وعدے محض وعدے نہیں بلکہ واقعات ہیں جو واقع ہو چکے ہیں۔

اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے بنی اسرائیل میں بعض انبیاء مبعوث ہو چکے تھے لیکن نبوت کا غیر منقطع سلسلہ آپ کے بعد شروع ہوا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت تک جاری رہا۔ بادشاہوں کے سلسلے کا تعلق تمام تر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہی کے دور سے متعلق ہے۔

یہاں اسلوب کا یہ فرق بھی قابل لحاظ ہے کہ سلسلۂ نبوت کی تعبیر کے لیے تو فرمایا ”جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ“ (تم میں انبیا بنائے) جب کہ سلسلۂ بادشاہی کے لیے فرمایا ”وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا“ (اور تم کو بادشاہ بنایا)

اس فرق سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت ایک مرتبۂ اختصاص ہے جو صرف اس سے مخصوص ہوتا ہے جس کو اللّٰہ تعالیٰ اس منصب پر فائز فرماتا ہے، دوسرے اس میں شریک نہیں ہوتے۔

اس کے برعکس بادشاہی ایک منصب اجتماعی ہے جس میں بادشاہ کے ساتھ اس کی پوری قوم حصہ دار ہوتی ہے۔ اگر کسی بادشاہی میں قوم شریک نہ ہو تو وہ استبداد اور مطلق العنانی ہے۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ حضرت موسی علیہ السلام نے اپنی قوم سے مذکورہ خطاب اس وقت فرمایا ہے جب وہ اس کو ارض مقدسہ پر حملہ کرنے کی دعوت دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ظہور میں نہیں آئی تھی لیکن اللّٰہ تعالیٰ نے حضرت موسی علیہ السلام کے توسط سے بصیغۂ ماضی مستقبل سے متعلق یہ وعدے فرمائے جو آگے چل کر پورے ہوئے۔

مذکورہ قرآنی مثالوں سے جہاں صیغۂ ماضی سے مستقبل کے معنیٰ مراد لینے کا اشکال رفع ہو گیا ہے وہاں یہ مؤقف

بھی صحیح ثابت ہو گیا ہے کہ وعدۂ استخلاف اپنی شرائط کے ساتھ پوری امّت سے ہے جب کہ خلفا صحابہ رضی اللہ عنہم اس وعدہ کے اوّلین مصداق ہیں اور کوئی مومن بالقرآن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلفا صحابہ رضی اللہ عنہم سے خارج نہیں کر سکتا۔ لہٰذا وہ بھی آیت استخلاف کے مصداق ہو گئے ہیں۔ بعض حضرات آیت استخلاف کے لفظ ''منکم'' سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اگر اس سے عام امّت مراد ہوتی تو لفظ ''منکم'' زائد اور بے فائدہ ہو جاتا اور اللہ تعالیٰ کا کلام زائد و بے فائدہ لفظوں سے پاک ہے۔ لہٰذا وعدہ استخلاف ان لوگوں سے ہے جو نزول آیت کے وقت موجود تھے۔ اور نزول سے پہلے ایمان لا چکے تھے۔

مشہور مناظر اسلام مولانا اللہ یار خان صاحب فرماتے ہیں کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ ضمیر حاضرین سے خاص ہے اگر کسی مقام پر غائبین کو حاضرین میں داخل کیا جاتا ہے تو وہ خارجی دلائل کی بنا پر ہوتا ہے۔ مثلاً اس پر اجماعِ امّت ہے کہ دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک جائے گا لہٰذا اس بنا پر عبادات مثلاً نماز، روزہ وغیرہ کے احکام، حلال و حرام کے احکام، نکاح و طلاق کے احکام اور میراث وغیرہ کے احکام میں غائبین کو حاضرین میں داخل کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنا ضروریات دین سے ہے کیونکہ احکامی آیات اس امر کی متقاضی ہوتی ہیں مگر یہ آیت تو انعامی ہے احکامی نہیں لہٰذا غائبین کو حاضرین میں شامل کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ''منکم'' میں ''من'' بعضیہ ہے بیانیہ نہیں کیونکہ ضمائر پر جو ''من'' داخل ہوتا ہے وہ بعضیہ ہے۔'' (الدین الخالص، ۲۱۱، ۲۴۳۔ مطبوعہ ادارہ نقشبندیہ اویسیہ چکوال)

موصوف کا یہ استدلال نہایت ہی کمزور ہے کہ آیت استخلاف محض انعامی ہے، احکامی نہیں لہٰذا غائبین اس میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اور اگر بالفرض اسے محض انعامی ہی قرار دیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ کس طرح اخذ کر لیا گیا کہ اس انعام کے مستحق نزول آیت کے وقت کے مؤمنین ہی ہیں آئندہ کے مؤمنین اس انعام سے محروم سمجھے جائیں گے؟

امام اہل سنّت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ فرماتے ہیں کہ:

''اس آیت استخلاف کا ربط سابقہ آیات سے یہ ہے کہ اوپر کی آیتوں میں حق تعالیٰ نے کافروں اور منافقوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اپنے دلائلِ قدرت و وحدانیت بیان فرما کر ان کو ایمان لانے کی ترغیب دی ہے۔ یہ آیت استخلاف اس ترغیب کا تکملہ اور تتمّہ ہے کہ دیکھو ایمان والوں کے لیے اس دنیا میں اِن اِن انعامات کا ہم نے وعدہ کیا ہے۔ اگر تم ایمان لاؤ تو ان انعامات سے تم بھی فیض یاب ہو گے۔'' (تحفہ خلافت، ص: ۱۱۰۔ مطبوعہ تحریکِ خدّام اہل سنّت جہلم)

موصوف کی توضیح سے ثابت ہو گیا ہے کہ وعدہ استخلاف میں مستقبل کے مؤمنین بھی شامل ہیں۔

جمہور اہلِ اسلام اس امر پر متفق ہیں کہ خلیفہ کا مقرر کرنا امّت کے لیے واجب ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک خلافتِ اسلامیہ کا قیام دین کے سب سے بڑے واجبات میں سے ہے۔ خلافت صرف انعام کے طور پر ہی نہیں عطا کی جاتی بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت، دینِ اسلام کی حفاظت اور امورِ دنیا کے نظم و نسق جیسے اہم مقاصد کے حصول کے لیے عطا کی جاتی ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ:

''خلافتِ عامّہ اس عمومی سربراہی اور ریاستِ عامّہ کا نام ہے جو اقامتِ دین کے کام کی تکمیل کے لیے وجود میں آئے۔ اس اقامتِ دین کے دائرہ کار میں علوم دینیہ کا احیاء، ارکانِ اسلام کا قیام، جہاد اور اس کے متعلقات کا انتظام مثلاً لشکروں کی ترتیب، جنگ میں حصہ لینے والوں کے حصص و مالِ غنیمت میں ان کا حق، نظامِ قضا کا اجراء، حدود کا قائم کرنا، مظالم وشکایات کا ازالہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی ادائیگی شامل ہے اور یہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت اور نمائندگی میں ہونا چاہیے۔'' (موصوف اس تعریف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ)

''ریاستِ عامّہ کے لفظ سے وہ علما خارج ہوگئے جو علومِ دینیہ کی تعلیم دیا کرتے ہیں اور شہر کے قاضی اور لشکر کے افسر بھی خارج ہوگئے جو خلیفہ کے حکم سے ان کاموں کو انجام دیتے ہیں اور قرنِ اوّل میں وعظ ونصیحت کرنا بھی خلافت کا ایک ضمیمہ تھا اور دین قائم رکھنے کے لحاظ سے وہ جابر اور ظالم بادشاہ خارج ہوگئے جو ملک پر حکومت وغلبہ حاصل کر کے غیر مشروع طریقہ سے خراج وصول کرتے ہیں۔ اور بالفعل (بالتعدی) کے لفظ سے وہ شخص خارج ہوگیا جو اگرچہ کامل طور پر دین قائم رکھنے کی قابلیت رکھتا ہو اور اپنے ہم عصر لوگوں سے افضل بھی ہو لیکن بالفعل اس کے ہاتھوں سے کوئی کام امور مذکورہ میں سے انجام نہ پائے۔ پس ایسا شخص خلیفہ نہیں ہوسکتا جو پوشیدہ ہو اور جس کو فتح وغلبہ حاصل نہ ہو اور نیابتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قید انبیا کو خارج کر دیتی ہے کیونکہ بحث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت میں ہے اور حضرت داؤد علیہ السلام خلیفۃ اللّٰہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفۃ اللّٰہ کا لقب پسند نہ کیا اور فرمایا مجھے خلیفۃ الرسول کہا کرو۔'' (ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، جلد: اوّل، صفحہ: ۱۳۔۱۶)

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ خلافت وامارت وہ عمومی ریاست ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں اقامتِ دین اور حفاظتِ دین کے فرائض سرانجام دیتی ہو۔ تو اب سوال یہ ہے کہ کیا اقامتِ دین اور حفاظتِ دین کا فریضہ صرف آیتِ استخلاف کے نزول کے وقت حاضر مؤمنین کے ساتھ ہی خاص تھا؟ کیا خلافتِ اسلامیہ کا قیام واجباتِ دین میں سے نہیں ہے؟ کیا مقاصدِ خلافت ضروریاتِ دین میں سے نہیں ہیں؟ کیا وعدہ استخلاف محض انعامی ہے احکامی نہیں؟

یقیناً زیر بحث آیت میں وعدہ خلافت باعتبار اہمیت انعامی کے ساتھ ساتھ احکامی بھی ہے۔ کیونکہ خلافتِ موعودہ اقامتِ دین، تمکینِ دین اور امن وغیرہ جیسی مطلوبہ نعمتوں کے حصول کا ذریعہ بنتی ہے۔

لہٰذا خلفا صحابہ رضی اللہ عنہم بشمول حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تو آیت استخلاف کے اوّلین مصداق ہیں ہی مگر ان کے ساتھ ساتھ غائبین بھی شرائط استخلاف کے ساتھ آیت کے عموم میں شامل ہیں۔

جہاں تک آیت میں ''منکم'' میں ''من'' کے بعضیہ ہونے کا تعلق ہے تو مخالفین اور اعدائے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسی تصور کے پیشِ نظر ایک دوسری آیت کو تختۂ مشق بنایا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا. (سورۃ الفتح: ۲۹)

ترجمہ: اللہ نے وعدہ فرمایا ہے جو ایمان لے آئے اور نیک اعمال کرتے رہے ان سے مغفرت کا اور اجرِ عظیم کا۔

یہاں بھی ''من'' ضمیر پر ہی داخل ہے جو مولانا اللہ یار خان صاحبؒ کے اصول کے مطابق 'بعضیہ'' ہے۔ اہلِ تشیع کا

مؤقف بھی یہی ہے جس سے انہوں نے مذکورہ آیت میں ''من'' کو تبعیضیہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ '' آیت میں جملہ صحابہ کی مغفرت کے لیے وعدہ نہیں کیا گیا بلکہ ''منہم'' کی بنا پر صرف وہ صحابہ اس وعدہ الٰہی میں شامل ہیں جن کے لیے ایمان اور عمل صالح ثابت ہو''

جب کہ مفسرین کرام نے ''منہم'' کے باوجود جملہ صحابہ رضی اللہ عنہم (موجودین وغائبین) کو آیت کا مصداق قرار دیا ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں کہ:

''حضرت کے سب اصحاب ایسے ہی تھے...... بعض دوسرے بزرگوں نے ''وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا '' کو علی الترتیب خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم پر تقسیم کر دیا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت تمام جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی بہیئت مجموعی مدح ومنقبت پر مشتمل ہے۔ خصوصاً اصحابِ بیعتِ رضوان کی، جن کا ذکر آغاز سورۃ سے برابر چلا آ رہا ہے۔'' (تفسیر عثمانی: تحت الآیۃ)

امام اہل سنت مولانا عبدالشکور لکھنوی لکھتے ہیں کہ:

یہ ضمیر ''منہم'' کی ''الذین معہٗ'' کی طرف نہیں پھر سکتی ورنہ معاذ اللہ کلام میں تعارض ہو جائے گا کیونکہ ''الذین معہٗ'' کے جو اوصاف اوپر بیان فرمائے ہیں وہ بتا رہے ہیں کہ وہ سب کے سب مومن صالح تھے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ ان میں کچھ لوگ صالح ہوں، کچھ غیر صالح بلکہ یہ ضمیر اس جماعت کی طرف پھر رہی ہے جس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو بعد میں داخل اسلام ہوئے۔ کھیتی کی مثال سے اسلام کی ترقی اور نئے لوگوں کا اس میں داخل ہونا مفہوم ہو رہا ہے۔ (تحفۂ خلافت: صفحہ: ۵۱۸، تحت تفسیر آیت معیّت)

اس عبارت میں موصوف نے جہاں اہل تشیع کا رد فرمایا ہے وہاں یہ بھی صراحت کی ہے کہ ''منہم'' کی ضمیر کا مرجع ''الذین معہٗ'' نہیں ہے بلکہ یہ ضمیر اس جماعت کی طرف پھر رہی ہے جس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو بعد میں داخلِ اسلام ہوئے۔ حالانکہ یہاں بھی آیت استخلاف کی طرح ''وعد، امنوا، عملوا'' ماضی کے صیغوں کے ساتھ ''من'' ضمیر غائب پر داخل ہے لیکن اس کے باوجود مستقبل کے مومنین پر بھی اس کا اطلاق کیا گیا ہے اور آیت معیّت کے ''منہم'' کو آیت استخلاف کے ''منکم'' کی طرح نہ تو بے کار قرار دیا گیا ہے اور نہ ہی بعضیہ۔

اب آیت استخلاف اور آیت معیّت دونوں کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ''　　(آیت استخلاف)

''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ''　　(آیت معیّت)

دونوں آیتوں کے الفاظ میں غائب وحاضر کی ضمیر اور عَمِلُوا الصّٰلِحٰت کی تقدیم وتاخیر کے علاوہ کوئی فرق نہیں ہے لیکن آیت معیّت میں ماضی کے صیغے اور ''منہم'' کی ضمیر کے باوجود صلح حدیبیہ کے بعد ایمان لانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بھی وعدۂ مغفرت اور اجرِ عظیم کا اطلاق کیا گیا ہے۔

آیتِ استخلاف میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اسی طرح کی خلافت عطا کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا جس طرح کی خلافت بنی اسرائیل کو عطا کی گئی تھی۔

امامِ اہلِ سنّت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ لکھتے ہیں کہ:

''بنی اسرائیل کی خلافت سے باتفاق مفسرین حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خلافت مراد ہے کہ ان کے بعد تین خلیفہ بڑے جاہ وجلال کے ہوئے۔ حضرت یوشع، حضرت کالب، حضرت یوساقوس۔ ان خلفائے بنی اسرائیل کے حالات اور فتوحات ہمارے تینوں خلفا سے ملتے جلتے ہیں اور بعض مفسرین نے حضرت داؤد کی خلافت مراد لی ہے کہ ان کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام خلیفہ ہوئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کی قوت وشوکت ضرب المثل ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں مراد ہوں۔'' (تحفہ خلافت۔ مجموعہ تفسیر آیاتِ قرآنی، صفحہ:۱۱۳)

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے انتقال کے بعد جب یوشع بن نون کی قیادت میں فلسطین فتح ہوا تو بنی اسرائیل اپنی کوئی متحدہ حکومت قائم نہ کر سکے بلکہ قبائلی عصبیت میں مبتلا ہو گئے۔ ساڑھے تین سو سال سے زائد مدت تک یہی طوائف الملو کی کا دور رہا۔ یہاں تک کہ قوم عمالقہ کے سابقہ مشرک قبائل نے متحدہ محاذ بنا کر بنی اسرائیل کو فلسطین کے بڑے حصے سے بے دخل کر دیا اور تابوت سکینہ بھی چھین لیا۔ اس وقت حضرت سموئیل علیہ السلام نے بحکمِ الٰہی حکومت کا نظم اپنے ایک رفیق جناب طالوت کو سونپ دیا۔ قرآن مجید نے نبی کی زبان سے یہ اعلان کرایا کہ:

''اِنَّ اللّٰہَ قَدۡ بَعَثَ لَکُمۡ طَالُوۡتَ مَلِکًا'' (سورۃ البقرہ:۲۴۷)

ترجمہ: بے شک اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔

پھر ان ہی کی زیر قیادت تین سو تیرہ (۳۱۳) مؤمنین صالحین کی مختصر سی فوج نے جالوت اور اس کے بڑے لشکر کا مقابلہ کرتے ہوئے اسے شکست سے دوچار کر دیا۔ جالوت حضرت داؤد کے ہاتھ سے مارا گیا جو اس وقت بالکل نوعمر تھے اور طالوت کی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شامل تھے۔ اس عظیم فتح کے بعد بنی اسرائیل کی مستحکم حکومت شام وفلسطین میں قائم ہوئی اور طوائف الملو کی کا دور ختم ہوا۔ حضرت طالوت کی حکومت تقریباً ۱۶ سال ۱۰۲۰ ق م سے لے کر ۱۰۰۴ ق م تک قائم رہی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت بھی تقریباً چالیس سال ۹۶۵ ق م سے لے کر ۹۲۶ ق م تک قائم رہی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کے بیٹے (حبعام) ۱۷ سال تک عدل وتقویٰ کے ساتھ حکمرانی کرتے رہے بالآخر قوم کی اخلاقی برائیوں کے باعث ان کی حکومت زوال پذیر ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو جو خلافت عطا فرمائی تھی (جس کے ساتھ آیت استخلاف میں خلافت محمد یہ کو تشبیہ دی گئی) اس کی کل مدت ایک سو تیرہ (۱۱۳) سال بنتی ہے۔

مذکورہ تمام خلافتیں وحکومتیں اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ تھیں۔ آیت استخلاف میں اسی طرح کی خلافت امّت مسلمہ کو بھی دینے کا وعدہ کیا گیا کہ وہ خلافت بھی تقریباً اتنی ہی مدت تک قائم رہے گی اور اس کی پسندیدہ بھی ہوگی۔ اگر اس مدت سے زیادہ ہو جائے تو تشبیہ کے خلاف نہیں کیونکہ آیت میں تشبیہ صرف استخلاف کو نہیں دی گئی بلکہ نوعیت وکیفیت استخلاف کو نوعیت وکیفیت

استخلاف سے دی گئی ہے۔ اگر یہ نہ سمجھا جائے تو تشبیہ سے کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ عطائے اقتدار میں مشابہت ہونے سے کیا فائدہ؟ یہ مشابہت تو اسے ہر سلطنت وحکومت کے ساتھ حاصل ہوتی ہے خواہ وہ اہل حق کی سلطنت ہو یا غیر مسلموں کی۔ اس میں اہل ایمان کے اقتدار کی کیا تخصیص ہے؟

ان تصریحات سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ آیتِ استخلاف کے عموم میں وعدۂ استخلاف پوری امّت مسلمہ بالخصوص صحابہ کرام رضی اللّٰہ عنہم سے ہے جو آیت مقدسہ کے اوّلین مخاطب تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللّٰہ عنہ بھی بحیثیت صحابی یقیناً آیت استخلاف کے مصداق ہیں نیز آیت کریمہ کو خلفائے اربعہ تک محدود کرنے اور حضرت معاویہ رضی اللّٰہ عنہ کو اس سے خارج کرنے سے ”وَ مَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ“ کی وعید میں شامل ہونے کا بھی احتمال ہے۔ جب کہ حضرت معاویہ رضی اللّٰہ عنہ کو اس کا مصداق قرار دینے سے نہ تو خلفائے اربعہ رضی اللّٰہ عنہم کی تنقیص لازم آتی ہے اور نہ ہی اس میں کسی قسم کا کوئی دینی خطرہ پایا جاتا ہے۔

اگر بالفرض آیت استخلاف میں وعدۂ استخلاف سے موعود خلفائے اربعہ رضی اللّٰہ عنہم کو ہی قرار دیا جائے تو پھر بھی حضرت معاویہ رضی اللّٰہ عنہ اس کے مصداق ہیں کیونکہ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ خلفائے اربعہ رضی اللّٰہ عنہم کے علاوہ دوسروں کو خلافت عطا نہیں کریں گے۔ اس کا یہ مفہوم اخذ کرنا صحیح نہیں ہے کہ خلفائے اربعہ رضی اللّٰہ عنہم سے چونکہ خلافت کا وعدہ کیا گیا ہے اس لیے وہ خلفائے راشدین ہیں اور نزول آیت کے وقت مشرف بہ اسلام نہ ہونے والوں سے ایسا وعدہ نہیں کیا گیا اس لیے وہ غیر راشد خلفا ہیں۔ یہ ”مفہوم مخالف“ ہے اور مفہوم مخالف بالخصوص احناف کے نزدیک وجوہِ فاسدہ میں شمار ہوتا ہے۔ لہٰذا مفہومِ مخالف مراد لے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت راشدہ کی نفی کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ خلافت کے لیے صرف ”موعودلہم“ ہونا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اہلِ حلّ وعقد کی طرف سے تقرری اور بیعت بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے اربعہ رضی اللّٰہ عنہم کے بعد آیتِ تمکین اور آیتِ استخلاف کی رو سے موعودلہم کی موجودگی کے باوجود ان میں سے نہ تو کسی کی تقرری عمل میں آئی اور نہ ہی کسی کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔

حضرت علی رضی اللّٰہ عنہ کی شہادت کے بعد دارالخلافہ کوفہ میں موجود اہلِ حلّ وعقد نے حضرت حسن رضی اللّٰہ عنہ کو منصبِ خلافت پر فائز کر دیا جنہوں نے چھ ماہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللّٰہ عنہ کے حق میں خلافت سے دست برداری اختیار کر لی۔ اس طرح حضرت معاویہ رضی اللّٰہ عنہ (جو خود بھی از روئے قرآن مجید راشد ہیں) ایک خلیفہ راشد حضرت حسن رضی اللّٰہ عنہ اور اہلِ حلّ وعقد کی تجویز اور بیعتِ عامّہ کی بنا پر سریر آرائے خلافت ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان ”راشدین“ نے کسی غیر راشد شخص کو منصب خلافت پر فائز نہیں کیا تھا اور نہ ہی حضرت حسن رضی اللّٰہ عنہ خلافت سے اس بنا پر دست بردار ہوئے تھے کہ اب حدیثِ سفینہ رضی اللّٰہ عنہ کی رو سے خلافتِ راشدہ کی تیس سالہ مدّت ختم ہوگئی ہے۔

نوٹ: حدیث سفینہ پر جامع اور مفصّل بحث ماہنامہ نقیب ختم نبوت کے آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔